وعدے کی پابندی

خرّم مُرادؔ

منشورات

00098 / 8

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمُ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ
عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اٰیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ :
اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ ،وَ اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ ، وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ

[بخاری]

باسمہ

جن اخلاقی صفات پر ہماری زندگی کی بہتری کا دارومدار ہے، ان میں سے ایک اہم اخلاقی صفت یہ ہے کہ انسان اپنے وعدے کو پورا کرے۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آیۃُ المنافِق ثلاثٌ ''منافق کی تین نشانیاں ہیں'' اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخلَفَ، وَاِذَا عٰهدَ غَدَرَ، ''جب بات کرے جھوٹی کرے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب عہد کرے تو اس عہد کو توڑے۔

مسلم کی روایت میں اس کے بعد کچھ اور الفاظ بھی ہیں اور وہ یہ ہیں: 'وَاِنْ صَلّٰی وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّــه مُسْلِمٌ' اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور یہ زعم رکھے کہ میں مسلمان ہوں۔ دیگر روایات میں کچھ دوسرے الفاظ کا بھی اضافہ ہے۔ ''اگرچہ وہ نماز پڑھے، روزہ رکھے، حج کرے، عمرہ کرے اور اپنے بارے میں یہ زعم رکھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے، اس کے باوجود یہ نشانی، منافقت کی نشانی ہے۔''

اس حدیث میں منافق کی تین نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ تینوں کے مطلب ایک دوسرے سے قریب قریب ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی ہیں۔ بعض روایات کے اندر یہ الفاظ بھی ہیں: وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ ''جب کوئی امانت سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔''

جھوٹی بات بہت وسیع چیز ہے۔ جھوٹ برائیوں کی سب سے بڑی بنیاد ہے اور سچائی پر قائم رہنا، سچائی کی تلاش کرنا اور پہچاننا اور قبول کرنا پورے دین کی بنیاد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سچے تھے، اس لیے ماننا پڑا کہ قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ثبوت ایسا

نہیں ہے جس سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے۔ جو بھی دلیل ہم دیں گے، اس کے مخالف بھی دلیل دی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر نبی کریم ﷺ سچے تھے اور آپ ﷺ کا یہ بیان، دعویٰ اور قول تھا تو اس گواہی کے بعد شک وشبہ کی کوئی گنجایش نہیں رہتی۔ دین کی ساری تعلیم سچائی پر مبنی ہے۔ کسی آدمی کا ایمان لانا بھی سچائی کو ماننا ہے۔ ایمان بھی ایسا مطلوب ہے جو سچا ایمان ہو۔ سچے ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دل میں کچھ اور نہ ہو اور عمل کسی اور قسم کا نہ ہو۔ جو بات زبان پر ہو، دل بھی اسے سچ جانتا ہو۔ عمل بھی اس کی تصدیق کرے کہ جو کچھ زبان پر ہے وہ دل میں بھی سچا مانا جا رہا ہے اور عمل بھی سچائی کی گواہی دے رہا ہے۔ فقہا نے ایمان کی تعریف یہی کی ہے کہ زبان سے اقرار ہو، دل سے تصدیق ہو اور جسم کے اعضا سے اس کے مطابق عمل ہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اپنی رضامندی سے غائب ہو تو پھر ایمان صحیح نہیں رہتا۔ اگر آدمی دل میں سچا جانتا ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتا، اور اس کو اقرار کرنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے تو یہ بھی منافقت کی بات ہے۔ ہاں اگر جان کا خوف ہو تو آدمی کو اجازت ہے کہ اقرار نہ کرے بلکہ جان کے خوف سے کلمۂ کفر کہنے کی بھی اجازت ہے۔ لیکن اگر کسی کو خوش کرنے کے لیے، لعنت و ملامت کے ڈر سے آدمی سچی بات کا اقرار نہیں کرتا تو اس کی اجازت نہیں۔ اگر زبان پر سچی بات ہو اور دل میں عمل اس کے مخالف ہو تو قرآن مجید نے اس کے بارے میں فرمایا کہ یہ تو خالص منافق آدمی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ منافق آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ یہ بات سچی کہہ رہے ہیں، جب وہ یہ کہتے ہیں کہ : نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ، ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں تو بالکل صحیح بات کہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ط وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ٥ [المنٰفقون ۶۳:۱]، اللہ تعالیٰ بھی جانتا ہے کہ آپ ﷺ اس کے رسول ہیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔ سچی بات کہنے کے باوجود جھوٹے ہیں، یعنی دل اور زبان میں جو جھوٹ ہے اس کو بھی منافقت کہا گیا ہے۔

منافق کے حوالے سے حدیث میں جو تین نشانیاں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے پہلی بات تو جامع ہے کہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ اس کے بعد کی دو باتیں دراصل اسی کی تشریح ہیں۔ وعدہ کرنا اوراس کے خلاف کرنا، یہ بھی جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ عہد باندھنا اوراس کوتوڑنا' یہ بھی جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ ان تینوں صفات کا خلاصہ جھوٹ ہے۔ منافق فی الواقع جھوٹا ہوتا ہے۔ اسی لیے منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، وعدہ توڑتا ہے اور عہد کے خلاف کرتا ہے۔

وعدے کا لفظ یہاں علیحدہ آیا ہے اور عہد کا لفظ علیحدہ۔ ان دونوں کا الگ الگ استعمال کیوں کیا گیا؟ یہاں پر وعدے کا لفظ زبانی قول وقرار کے معنی میں ہے اور عہد کا لفظ بہت وسیع ہے۔ ایک یہ کہ آدمی زبان سے کسی چیز کا اقرار کرے، پھر اس کے خلاف کرے اور دوسری بات یہ کہ جس عہد کا وہ پابند ہے، اس عہد کو وہ توڑے۔ عہد کے لفظ پر غور کریں تو یہ پوری حدیث اور وعدے کی پابندی کے معنیٰ اور دین میں اس کی اہمیت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہاں پر یہ لفظ اس طرح سے ہے کہ وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے۔ بعض احادیث میں اس طرح ہے کہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ عہد باندھتا ہے تو توڑتا ہے۔ کوئی امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرتا ہے۔ یہاں پر عہد کا لفظ زبانی قول وقرار میں شامل ہے۔ جو آدمی بھی اس بات کا اقرار کرے کہ میں ایسا کروں گا، تو بات چھوٹی ہو یا بڑی ہر طرح کی بات اس کے اندر شامل ہے۔ زبانی قول وقرار سے بڑھ کر اس کے اندر وہ سارے معاہدے بھی شامل ہیں جو معروف طریقے سے معاشرے کے اندر مسلّم سمجھے جاتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کا عہد۔ اگر آدمی زبان سے اقرار نہ بھی کرے تو وہ بندگی کا اس لیے پابند ہے کہ وہ معروف طریقے سے دسترخوان پر اس کا دیا ہوا کھاتا ہے، اس کے بنائے ہوئے گھر میں رہتا ہے، اس کی بنائی ہوئی چھت کے نیچے بسیرا کرتا ہے اور اس کا اتارا ہوا پانی پیتا ہے۔ قرآن مجید نے انھی دلائل کی طرف کثرت سے بار بار اشارہ کیا اور بندگی کی دعوت اسی کے حوالے سے دی ہے۔ جس نے آسمان کو چھت بنایا اور زمین کو فرش بنایا اور آسمان سے پانی اُتارا، اسی کی بندگی کرو کیونکہ تم اس کی بندگی کے پابند ہو۔

عہد کا لفظ کسی خاص چیز کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے، جس میں آدمی ذمہ داریاں اُٹھانے کا وعدہ کرے، مثلاً ریاست کے مناصب یا دوسرے عُہدوں کے لیے حلف اُٹھائے جاتے ہیں، یا کوئی آدمی اس ریاست کے قوانین کی اطاعت کا عہد کرتا ہے تو یہ بھی اس عہد کے اندر شامل ہے۔ پھر معاشرے کے اندر وہ حقوق جو انسانوں کے اندر جانے پہچانے ہیں، جن کو سب مانتے ہیں، ان کا اگر وہ زبان سے اقرار نہ بھی کرے یا لکھ کر نہ بھی دے تب بھی اس کی حیثیت ایک عہد کی سی ہے۔ مثال کے طور پر ایک بیٹا اپنے باپ کو یہ لکھ کر نہ بھی دے کہ میں نے تمھاری خدمت کا، اطاعت کا اور تمھارے ساتھ اچھے سلوک کا عہد کیا ہے، تب بھی معاشرے کے اندر یہ مُسلّم اور معروف ہے، اس لیے یہ عہد کی تعریف میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عہد کو دین کی بنیاد قرار دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی یوں فرمایا ہے کہ جسے پاسِ عہد نہیں، اس کا کوئی دین نہیں۔ لَا اِیْمَانَ لِمَن لَّا اَمَانَتَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَھْدَلَہٗ ’’جسے امانت داری کا پاس نہیں، اس کا کوئی ایمان نہیں اور جسے اپنے قول و قرار اور عہد کا پاس نہیں، اس کا کوئی دین نہیں۔‘‘

دین تو پوری زندگی میں اللہ کی بندگی کا نام ہے۔ یہ بندگی کے اقرار پر قائم ہوتا ہے۔ بندگی کے اقرار کا اللہ تعالیٰ نے دو طرح سے ذکر کیا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ تم نے اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھایا ہے اور ان کے بارے میں تم کسی طرح بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کسی اور کی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ اس لیے وہ بار بار سوال کرتا ہے کہ یہ آسمان و زمین کس نے بنائے؟ آسمان سے پانی کون اُتارتا ہے؟ رات کے بعد دن، اور دن کے بعد رات کون لاتا ہے؟ تو کہتے ہیں: اللہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم رات کو اتنا طویل کر دیں کہ سورج نہ نکلے، تو کیا دُنیا کے اندر کوئی ہے جو اس رات کو دن میں بدل سکے۔ لوگ کہیں گے، نہیں، ایسا کوئی نہیں۔ اس کے واسطے سے پھر وہ کہتا ہے کہ اللہ کی بندگی کرو۔

وہ ایک اور اشارہ بھی کرتا ہے کہ ہم نے سارے بنی آدم کو ازل میں جمع کیا۔ ان سے پوچھا: اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ [الاعراف ۷:۱۷۲] ’’کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ قَالُوْا بَلٰی،

تو اُنھوں نے کہا: کیوں نہیں'' تُو ہمارا رب ہے۔ اس کو ہم عہدِ ازلی کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ عہد جو ابتدا ہی میں مخلوق نے اپنے خالق سے باندھ لیا تھا۔ جب خالق نے بندگی کا اقرار کروایا تھا کہ مجھے ہی اپنا رب تسلیم کرو تو اُنھوں نے اس کو ماننے کا اقرار کیا تھا۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمیں یاد نہیں، ہمارے حافظے میں یہ محفوظ نہیں ہے کہ ہم نے کسی دن کھڑے ہو کر اس بات کا اقرار کیا ہو۔ پھر اس عہد کی نوعیت کیا ہے؟ معنیٰ کیا ہیں؟ اس پر مُفسّرین نے بہت گفتگو کی ہے کہ واقعی کوئی ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا، یا اس سے مراد اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رب کی جو طلب اور جستجو رکھی ہے، وہ ہے۔ رَب اور بندگی کی تلاش، خواہ آدمی مانتا ہو یا نہ مانتا ہو، خواہ بتوں کے پیچھے جاتا ہو، ازل سے انسان کی فطرت کی جستجو ہے۔ وہ پتھر کے آگے سر ٹیک دے، سورج کو اپنا رب مانے، چاند کے آگے سر جھکالے، انسانوں کو رب بنالے، چاہے اس کے پاس جائے جو ساری دُنیا کو بنانے والا ہے لیکن بندگی اس کی فطرت کے اندر اس طرح گُھلی ہوئی ہے کہ اس سے وہ انکار نہیں کر سکتا اور کسی نہ کسی کو اپنا معبود ضرور بناتا ہے۔ یہ عہد ہے جس پر انسان قائم ہے۔

پھر دیکھیں، ایمان بھی ایک معاہدہ ہے۔ ایمان اقرار بھی ہے اور معاہدہ بھی۔ چنانچہ جب اللہ نے ایمان کی تعریف فرمائی تو ایک طرف تو جو ایمان لانے والے ہیں ان کی طرف سے تعریف یوں فرمائی ہے کہ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط [البقرہ ۲:۲۰۷] ''وہ لوگ جو کہ اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں، اللہ کی رضا چاہنے کے لیے۔'' یعنی اس قیمت کے عوض پر۔ یہ ایمان کی تعریف ہے۔ اپنے آپ کو فروخت کرنا، بیچنا ایک معاہدہ ہے، عہد ہے اور ایک وعدہ ہے، جس میں آدمی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرتا ہے اور اس کے بدلے میں اس کی رضا کی قیمت قبول کرتا ہے اور اس پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہ تو بندوں کی طرف سے ہے۔ اللہ کی طرف سے اس کی تشریح یوں ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ [التوبۃ ۹:۱۱۱] ''اللہ نے مومنین سے ان کے جان و مال خرید لیے ہیں، اس بات کے بدلے میں کہ ان کے لیے جنت ہے۔''

یہ بھی ایک معاہدہ ہوگیا۔ایمان کوئی موروثی چیز نہیں ہے کہ ماں باپ سے سن کر حاصل کر لیا ہو۔ایمان کوئی سنی سنائی چیز نہیں ہے کہ جس کو زبان سے ادا کر دیا ہو۔ایمان چند الفاظ کا نام بھی نہیں ہے۔ایمان دراصل ایک عہد ہے، اس بندے اوراس کے پیدا کرنے والے کے درمیان خرید وفروخت کا ایک معاہدہ ہے۔جو ایمان لاتا ہے وہ اپنی ہر چیز اللہ کی راہ میں بیچ دیتاہےاورآخرت میں ملنے والی قیمت کے بدلے بیچتا ہے۔پس خوشی مناؤ،اس لیے کہ تم نے جو معاہدہ کرلیا ہے، اللہ سے جو عہد باندھ لیا ہے، یہ سب خوشی منانے والی چیزیں ہیں۔تم نے بہت حقیر چیز دے کر ایک فانی زندگی دے کر، وہ چیز حاصل کی ہے جس کی کوئی قیمت نہیں۔ فرمایا کہ اللہ نے خریدا ہے، اس نے جنت کی قیمت دینے کا وعدہ کیا ہے، اس سے بڑھ کر کون اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہے۔اسی طرح آدمی اگر یہ کہے کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ﷺ ہیں،تو دراصل وہ آپ ﷺ کی اطاعت کا عہد کرتا ہے۔رسول آیا،اس نے اس بات کا مطالبہ کیا کہ اللہ کی بندگی کرو، وَاَطِیعُونِی ،اورمیری اطاعت کرو۔اللہ نے بھی اس بات کو بہت کھول کر بیان فرمایا کہ :مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ [النساء ۴:۸۰]’جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔‘‘ گویا جس نے رسول کا کہنا مانا، اس نے اللہ کا کہنا مانا، جو رسول کی مرضی کے پیچھے چلا، وہ اللہ کی مرضی کے پیچھے چلا۔

اللہ تو ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔اس نے آکر ہمیں احکام نہیں دیے ہیں کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں، اس کی بندگی کے عہد کے کیا تقاضے ہیں اور کیا قیمت ہم کو ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اللہ کا رسول انسانوں ہی میں سے آتا ہے۔ وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے اللہ نے بھیجا ہے۔ جو اس بات، اس دعوے کو نہ مانے وہ تکذیب کا مرتکب ہے۔لیکن جو اس بات کو جان لے اور ماننے کے بعد بھی رسول کا کہنا نہ مانے، اور نہ اس کے پیچھے چلے، اس کی بات کے بارے میں شک وشبہ میں رہے تو وہ آدمی بدعہدی کا مرتکب ہوتا ہے کہ عہد کرنے اور ماننے کے بعد خلاف ورزی کرتا ہے۔رسول ﷺ کا تو یہ مقام ہے ’’کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق

نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دے تو پھر وہ اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرتا پھرے۔'' [الاحزاب ۳۳:۳۶]۔ امیر اور حاکم کی اطاعت آدمی خوش دلی کے ساتھ کرے یا بد دلی کے ساتھ کرے، لیکن کہنا ماننا ضروری ہے۔ وہ اس کا پابند ہے۔ ایک قانون آپ کو ناگوار بھی ہو، تو ناگواری کے ساتھ بھی اس کی اطاعت کریں، لیکن ناگواری کا ہونا کسی جرم یا کسی نقص کی بات نہیں ہے۔ اگر یہ ایمان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جو بات کہہ رہے ہیں، جو حکم دے رہے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے تو اس کے بعد دل کے اندر کسی ناگواری، تنگی یا تلخی کا ہونا ایمان کے منافی ہے۔

آدمی جو بھی عہد کرے، اس کی پابندی اس کے لیے ضروری ہے۔ عہد کے جو مختلف طریقے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کا لفظ اپنے اندر ہر اس چیز کو شامل کرتا ہے جس کا آدمی کرنے کا پابند ہے۔ یہ پابند وہ عقل کی رو سے فطرت، شرع اور معاشرے کے معروف و مسلّم قواعد کے تحت بھی ہو سکتا ہے اور اپنے قول و قرار کی نسبت سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے واضح طور پر اقرار کیا ہو کہ میں اس کی پابندی کروں گا۔ ہر جگہ یہ واضح اقرار ضروری نہیں ہوتا۔ کوئی آدمی سڑک پر گاڑی لے آئے اور داہنی طرف گاڑی چلانے پر اصرار کرے کہ میں نے کوئی معاہدہ نہیں کیا کہ میں بائیں طرف گاڑی چلاؤں تو اس کا حادثہ ہوگا، ہلاک بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں اقرار کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ جس معاشرے کے اندر وہ رہتا ہے، اس کے قانون کا وہ خود بخود پابند ہے۔ جب پابند ہے تو سڑک پر اسی طرف چلنے کا وہ پابند ہے جس طرف قوانین میں چلنے کی گنجایش موجود ہے۔ اسی طرح زندگی کی ٹریفک بھی ہے اور زندگی کی سڑک بھی۔ اس میں ہر چیز میں قول و قرار ضروری نہیں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس لیے کہ اگر وہ گاڑی غلط رخ پر لائے گا تو یقیناً اس کا حادثہ ہو سکتا ہے۔ وہ اگر ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کا یہ کہنا کہ ''میں لاعلم تھا'' اس کو جرمانے سے نہیں بچا سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو مغفرت کا ہے۔ وہ لاعلمی کا عذر بھی قبول فرمائے گا لیکن عام طور پر

زندگی کی شاہراہ پر اللہ کے قوانین کے تحت چلنا اس عہد میں شامل ہے۔ پھر زبانی قول وقرار کی پابندی لازمی ہے اور اس وعدے کے خلاف کرنا منافقت کی نشانی ہے۔

منافق کی تین نشانیاں اس حدیث کے اندر بیان کی گئیں: [۱] ایک یہ کہ بات کرے تو جھوٹ بولے، [۲] وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، [۳] عہد باندھے تو اس کو توڑ دے۔

یہ وعدہ جو آدمی زبانی قول وقرار کر کے کرتا ہے، یہ ہم عام زندگی میں بھی کرتے رہتے ہیں۔ گھروں کے اندر بھی ہم بے شمار وعدے کرتے ہیں۔ بچوں، بیوی، شوہر، بھائی بہنوں سے بھی بہت سے وعدے کرتے ہیں۔ کاروبار اور عام لین دین اور معاملات کے اندر بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر چیز کی پابندی ایمان کا تقاضا ہے اور وہ ضروری ہے۔ اور کسی چیز کی بھی خلاف ورزی منافقت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

حضور ﷺ نبی بنائے جانے سے پہلے تجارتی قافلے لے کر جایا کرتے تھے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ اس زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب آپ ﷺ تجارتی قافلے لے کر جایا کرتے تھے، میں نے ایک چیز آپ ﷺ سے خریدی اور خریدنے کے بعد میں نے کچھ قیمت آپ کو دی اور کہا، باقی قیمت آپ ﷺ کو میں بعد میں لا کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں بھول گیا۔ تین دن کے بعد مجھے یاد آیا۔ میں گیا تو میں نے حضور ﷺ کو اسی مقام پر پایا۔ آپ ﷺ تین دن سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے مجھے بڑی تکلیف دی، تین دن انتظار کرایا۔

وعدے کی پابندی یہ ہے کہ آدمی اگر کہہ دے کہ میں آؤں گا، تو وہ پہنچے۔ اور وقت کی پابندی یہ ہے کہ آدمی اگر کہہ دے کہ اس وقت آؤں گا تو اسی وقت پہنچے۔ وقت کی پابندی ہمارے معاشرے کے اندر ایک مفقود چیز ہے۔ یہ سمجھا ہی نہیں جاتا کہ کوئی کہہ دے کہ میں دس بجے آؤں گا تو یہ بھی کوئی وعدہ ہے اور یہ بات بھی وعدے کے اندر شامل ہے۔ دفاتر کے اوقات اگر مقرر ہیں اور ایک آدمی دفتر سے پوری تنخواہ وصول کرتا ہے تو یہ اس کا وعدہ ہے کہ وقت پر پہنچے گا۔ اس کا یہ معاہدہ ہوتا ہے۔ وہ اس معاہدے پر دستخط بھی کرتا ہے۔ یہ اس کا Employment

Contract ہے جس کے تحت وہ پابند ہے۔ وقت کی پابندی کو مسلمان معاشرے میں اس قدر ضائع کیا جا چکا ہے کہ آدمی اگر یہ کہے کہ کل آؤں گا یا پرسوں، تو اس کا یقین نہیں کیا جاتا کہ وہ وقت کی پابندی کرے گا۔ چار پانچ منٹ دیر ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ بھی وعدے کے اندر شامل ہے۔ گھروں کے اندر ہم بچوں، بیوی اور رشتہ داروں سے جو وعدے کرتے ہیں، ان کو بھی ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

ایک اور واقعہ یہ بھی حدیث میں موجود ہے کہ ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ میرے گھر تشریف فرما تھے۔ میں نے اپنے بچے سے کہا کہ اِدھر آؤ، میں تمھیں ایک چیز دوں۔ یہ ہمارے ہاں بہت عام ہے کہ آؤ بچو ہم تمھیں چاکلیٹ لے دیں۔ بہلانے اور پھسلانے کے لیے یہ عام سی بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمھاری نیت تو معلوم نہیں ہوتی دینے کی؟ یہ آپ ﷺ نے اعتراض نہیں کیا بلکہ سوال کیا کہ کیا تم واقعی کچھ دو گی؟ اُنھوں نے کہا: ہاں، میں کچھ دوں گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر دینے کی تمھاری نیت نہ ہوتی تو یہ بھی تمھارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین یا رسول ﷺ کی زندگی سے وعدے کی پابندی ہم کو اس حد تک ملتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے جہاں اپنے انبیا علیہم السلام کی تعریف کی ہے وہاں اس صفت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ وہ سچے تھے۔ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ [مریم ۱۹:۵۴]، ''وہ وعدے کا سچا تھا۔'' کئی انبیا علیہم السلام کے بارے میں قرآن مجید نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ وہ وعدے کے سچے تھے۔ سورۃ البقرۃ کے آغاز کے بعد سب سے پہلے اس نے تین ایسی صفات بیان کی ہیں جو اگر کسی کے اندر نہیں پائی جاتی ہیں تو وہ اللہ کی ہدایت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل کیے گئے ہیں جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا: الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖص وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ [البقرۃ ۲:۲۷] ''اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے کاٹتے ہیں، اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔''

جن قرابت داریوں کواللہ نے قائم کیا ہے، جو گھروں میں رشتے ہوتے ہیں، یہ بھی معاہدے ہیں، ان کو وہ کاٹتے ہیں۔ سورۃ الرعد میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ جو وعدے کی پابندی نہیں کرتے، اللہ کے ساتھ باندھے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں، بندگی، اطاعت، شریعت پر چلنے، ایمان کے تقاضے پورے کرنے کا عہد توڑتے ہیں، جس چیز کو جوڑنا اللہ نے لازم کیا ہے، اس کو کاٹتے ہیں۔ پھر ان کی تعریف فرمائی جو اللہ سے اپنے وعدوں کی پابندی کرتے ہیں، اور رشتوں کو جوڑتے ہیں۔ پھر اس کے بعد آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ظاہری نماز اور ظاہری رسم ورواج اور ظاہری مذہبیت، یہ دراصل نیکی نہیں ہے۔ لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ [البقرۃ ۲:۱۷۷] ''نیکی یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' ہاتھ باندھ لو، یہ نیکی نہیں ہے۔ یہ بات اس سیاق میں کہی جا رہی ہے جہاں قبلے کی تبدیلی کا حکم ہوا تھا اور بڑی اہمیت کے ساتھ تین دفعہ حکم دیا گیا تھا کہ جہاں کہیں بھی ہو، جس حالت میں بھی ہو، نماز پڑھو تو حرم کی طرف رُخ کرو۔ لیکن ان سب احکامات کے بعد اگر کسی کے ذہن میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ دین تو بس یہی ہے اور نیکی تو بس یہ ہے کہ آدمی مراسم کو ادا کرے اور قبلے کی طرف منہ کرے، تو یاد رہے کہ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے نکاح، طلاق، حج، نماز اور سارے احکام اس کے بعد آئے۔ بات واضح کر دی گئی کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ انسان مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرے۔ پھر اس کی تعریف بیان کی کہ نیکی کیا ہے۔ نیکی کی تعریف میں، ایمان، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کے حکم کے بعد کہا: وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا [البقرۃ ۲:۱۷۷] ''اور جو عہد بھی باندھتے ہیں، اس کو پورا کرتے ہیں۔'' اور پھر فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ [البقرۃ ۲:۱۷۷] ''یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔''

مسلم کی روایت میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو آدمی جھوٹ بولے، وعدہ خلافی کرے، عہد کو توڑے، وہ اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ بھی رکھتا ہو اور حج بھی کرتا ہو اور اس نے عمرہ بھی

کیا ہو، اور اپنے بارے میں اسے بڑا گمان ہو کہ میں تو بڑا اچھا مسلمان ہوں، اس کے باوجود یہ منافقت کی نشانی ہے۔

یہ بات قرآن مجید سے بالکل واضح ہے کہ دین کی جو عمارت تعمیر ہوتی ہے، اور صالح زندگی بنتی ہے، وہ اس دنیا میں بھی کامرانی کی طرف لے جاتی ہے اور آخرت میں بھی اللہ کی رضا اور جنت کی مستحق بناتی ہے۔ یہ تین اخلاقی صفات اسی زندگی کی بنیاد ہیں۔ یہ صفات نماز، روزہ، زکوٰۃ اور تقویٰ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر یہ اخلاقی صفات پیدا نہ ہوں تو محض نماز، روزہ اور زکوٰۃ انسان کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اس کے اندر یہ صفات ہونی چاہییں۔ اس کے بعد ہی وہ اللہ کا محبوب اور پیارا بن سکتا ہے۔ پھر فرمایا: کہ ہر وعدے کے بارے میں سوال ہوگا اور زبان کے بارے میں، آنکھوں اور کان کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔ اسی طرح جو عہد باندھا ہے اس کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔

جو عوامی عہد ہوتے ہیں، قومیں ایک دوسرے سے کرتی ہیں، ان کی بھی تاکید کی گئی کہ ان کی بھی پابندی کرو۔ کفار اور مشرکین نے مسلمانوں سے بدعہدیاں بھی کیں، ان پر مظالم بھی ڈھائے، ان کو ہر قسم کی تکلیفیں بھی پہنچائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ مسلمان اپنی جگہ پر بدعہدی کریں۔ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد سخت ترین حالات پیش آئے۔ مسلمانوں نے اس بات کا وعدہ کرلیا کہ کوئی وہاں سے ہماری طرف آئے گا تو ہم اسے واپس کر دیں گے۔ وہ آدمی جو اس معاہدے کے لیے گفت وشنید کر رہا تھا، اس کا بیٹا مسلمان ہو چکا تھا۔ اس کو بیڑیوں سے باندھ کر رکھا ہوا تھا، اور اس پر تشدّد بھی ہوتا تھا۔ اس وقت وہ نکل کے وہاں پہنچ گیا۔ اس شخص نے کہا: پہلے آپ یہی پابندی کیجیے کہ میرے اس بیٹے کو واپس کر دیجیے۔ ان ۱۴۰۰ آدمیوں کے لیے جو مرنے مارنے کی بیعت کر چکے تھے اور عرب کی وہ روایات جن میں غیرت کا اور اپنے قبیلے کا بڑا نام اور مقام تھا، ان کے لیے بڑی ذِلّت کی بات تھی کہ اپنا آدمی آئے اور اس کو اس طریقے سے واپس کر دیں۔ لیکن معاہدہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے

اسے واپس کردیا۔ پھر کچھ لوگ بھاگ کر مدینہ آئے اور مدینہ آنے کے بعد اُنھوں نے پناہ مانگی تو آپ ﷺ نے پناہ دینے سے بھی انکار کردیا۔ اور فرمایا کہ نہیں، ہمارا معاہدہ ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے اشارہ کردیا کہ اگر یہ چاہیں تو ان کے لیے راہ نکل سکتی ہے۔ وہ جاکر اس تجارتی راستے پر بیٹھ گئے جس پر کفار کے تجارتی قافلے شام جایا کرتے تھے، اور ان پر حملے شروع کردیے۔ اب نہ وہ مدینے کی اطاعت میں تھے اور نہ مکے کی اطاعت میں۔ اہلِ مکہ شکایت بھی نہیں کرسکتے تھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں مدینہ میں پناہ نہیں دی تھی۔

قوموں کے اندر جو معاہدے ہیں ان کی اس حد تک پابندی بھی ضروری ہے۔ قرآن مجید نے کہا کہ اگر تمھیں کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تمھیں بدعہدی کا حق نہیں۔ معاہدے کو توڑنے کا اعلان کردو، اس کو ان کی طرف واپس پھیر دو تو اس کے بعد پھر تم اس عہد کی خلاف ورزی کرسکتے ہو۔ پھر جب سارے مشرکین سے اعلان برأت ہوا تو اس میں یہ استثنیٰ کیا گیا کہ وہ لوگ جو اپنے عہد پر قائم رہے، ان کے ساتھ تم بھی اپنے عہد کو قائم رکھو۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے: مَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ○ [اٰل عمرٰن ۳:۷۶] ''جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا، کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔'' تقویٰ بھی عہد کی پابندی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا: اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ [البقرۃ ۲:۱۷۷] ''یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔'' اللہ انھی سے پیار و محبت کرتا ہے جو زندگی میں ایفائے عہد اور تقویٰ کی روش پر قائم رہتے ہیں۔

زبانی قول و قرار ہو، اتنی چھوٹی سی بات ہو کہ میں کل اتنے بجے آؤں گا یا بہت بڑے بڑے معاہدے ہوں، گھر کی زندگی میں ہوں یا کاروبار میں، یا ریاست کے مناصب تک جاتے ہوں، جو وعدے بھی انسان کرے، ان سب کی پابندی، ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ. اگر عہد کی پابندی نہ ہو تو نہ بندگی کا اعتبار ہے اور نہ اللہ کے عطا کیے ہوئے ایمان کا۔

عہد کی خلاف ورزی کے ساتھ انسانی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر عہد کی پاس داری نہ ہوتو تجارت، معیشت، حکومت کوئی چیز بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ جو کافر معاشرے ہیں ان کو بھی ایک حد تک پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو اعتبار جاتا رہتا ہے۔ اگر یہ حالت ہو جائے کہ لوگ کہیں کہ فلاں آدمی اس بستی کے اندر ایسا ہے جو ایمان دار ہے اور اسی طرح عہد کے بارے میں بھی کہا جائے کہ اس بستی میں صرف دو ہی آدمی ہیں جو وعدے کی پابندی کرتے ہیں تو یہ خرابی کی نشانی ہے۔ اس لیے اپنی زندگیوں میں اس بات کا خیال رکھیے کہ جو بھی بات زبان سے نکل جائے، جو بھی آدمی وعدہ کرے، اس کی پابندی ضروری ہے۔

یہاں پر دو تین باتیں اور ذہن میں رکھنی چاہییں۔ اگر آدمی کوئی وعدہ کرے اور کوئی ایسی مجبوری ہو جائے جس کی وجہ سے وہ وعدہ پورا نہ کر سکے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حدیث میں منافق کی تین نشانیاں بتائی گئی ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ جو آدمی جھوٹ بولے تو آپ فوراً جا کر اس کو کہیں کہ تو تو منافق ہو گیا، اور جو آدمی وعدہ خلافی کرے آپ اس پر منافق ہونے کا فتویٰ جاری کر دیں، اور جو اپنے عہد کو توڑے اس کو آپ منافق کہنا شروع کر دیں۔ اس لیے کہ منافقت کا کوئی کام کرنا اور منافق ہو جانا، اس میں بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اگر یہ فرق نہ ہو تو اُمت میں تفرقہ، انتشار اور فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر ہر آدمی دوسرے کو منافق، کافر اور مشرک قرار دینے لگے تو اس طرح اُمت کی وحدت پارہ پارہ ہو سکتی ہے۔ یہ سوچنا کہ یہ کام منافقت کا کام ہے یا مشرک کا کام ہے، یہ اپنی جگہ، لیکن کسی کو کافر کہنا، مشرک قرار دینا، اُمت سے خارج کر دینا اور منافق قرار دینا، اس کی اجازت اسلام میں نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ساتھ منافق کا ہونا ختم ہو گیا۔ اب تو ہم لوگوں کے ظاہر پر معاملہ کریں گے یا مومن ہے یا کافر۔ اگر ظاہر میں مومن ہے تو مومن، ورنہ کافر ہے۔ منافقت کا تعلق دل سے ہے اور دل کے اندر کوئی جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ اس کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔ اس لیے اُنھوں نے فرمایا کہ منافقت کا فیصلہ اب کوئی نہیں کر سکتا۔

حضور ﷺ کے زمانے میں جو منافق تھے، ان کے نام یا تو حضور ﷺ کو یاد تھے، یا ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو صیغۂ راز میں بتائے ہوئے تھے۔ معاشرے میں ان کو منافق کہہ کر نہیں پکارا جاتا تھا۔ بس ان کے کام منافقوں جیسے تھے۔

یہ احتیاط نہایت ضروری ہے۔ اس حدیث کو ہاتھ میں لے کر منافقت اور کفر کے فتوے جاری کرنے کی کوئی گنجایش اسلام میں نہیں ہے۔

جس حدیث کا مطالعہ کیا گیا ہے' اس کا اُردو ترجمہ درج ذیل ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ [بخاری]

❖❖❖